مطبوعات

THE CHALLENGE OF MODERNIZATION. تجدید کا چیلنج
تالیف: آئی-آر-سینائی
صفحات ۲۵۶- قیمت ۲۲ روپے ۵۰ پیسے

زیرِ نظر کتاب کا مجمل تعارف اشارات میں کرا دیا گیا ہے - یہاں ہم اس کتاب کے مندرجات پر قدرے تفصیل سے بحث کرتے ہیں، تاکہ مصنّف کے افکار و نظریات اور اُن کے طرزِ استدلال سے قارئین اچھی طرح واقف ہو سکیں -

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے - پہلے باب میں مغرب کے ایشیا پر اثرات، بلکہ اُحسانات" درج ہیں - اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آج ایشیا کے اندر انسانیت کے جو جوہر موجود ہیں اور یہاں آزادی و شرفِ آدمیت کے لیے جو تڑپ پائی جاتی ہے وہ مغربی استیلاء کی رہینِ منّت ہے -

دوسرے باب میں مغربی استعمار کی برکتیں گنوائی گئی ہیں اور اہلِ مشرق کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ "سفید فام" کے تسلط سے پہلے فکر سے یکسر عاری اور تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے بالکل تہی دست تھے، ان کے ہاں علم و ہنر کی آج جو روشنی پائی جاتی ہے وہ سفید نسل کی بابرکت حکمرانی کی منت کش ہے -

فاضل مصنّف اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ مغربی اقوام میں آج دولت کی جو ریل پیل ہے اس کے پیدا کرنے میں اُن محکوم ممالک کے بدنصیب محنت کشوں کا بھی کوئی حصہ ہے' جن کا لہو مغربی استعماریت جونک کی طرح چاٹتی رہی ہے -

اس کے بعد وہ اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغربی استعمار کے بار

میں جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے سیاسی استبداد، نسلی تفوق اور غلام ممالک کے قدرتی وسائل سے ناجائز انتفاع کا جذبہ کارفرما ہے، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ ان کے نزدیک یہ استعمار مشرقی قوموں پر ابرِ رحمت بن کر برسا۔ اس نے پہلی بار انھیں سلجھے ہوئے حیات آفریں تصورات سے آشنا کیا، صدیوں کے پرانے اور بوسیدہ نظامِ معاشرت و معیشت کو ہٹا کر، انہیں ایک عمدہ نظامِ حیات عطا کیا جو مغرب کی ترقی پسندانہ اقدار اور روشن افکار کا آئینہ دار ہے۔ یہ ایک ایسا انقلابی قدم تھا جس نے اہلِ مشرق کے سوچنے سمجھنے کے انداز بدلے اور اُن کے فکر و نظر کو نئی جلا دی۔ پھر مغرب نے ان قوموں کو امن امان کی دولت سے مالا مال کیا اور ایک مستحکم نظامِ حکومت کے تحت انہیں زندگی بسر کرنے کے آداب سکھلائے۔ اس کے علاوہ صنعت و حرفت کو مغربی استعمار کی بدولت بے حد ترقی نصیب ہوئی۔ اور اس کے نتیجے میں بڑے بڑے شہر آباد ہوئے اور جو پہلے سے موجود تھے اُن کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ لاتعداد سکول اور کالج قائم ہوئے اور مختلف جگہوں پر کئی ایک ہسپتال کھولے گئے۔ مغربی استعمار کے یہ کارنامے بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں لیکن مصنف کو اس سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اس نے اہلِ مشرق کو مغربی تہذیب میں صحیح طور پر رنگنے کے لیے کوئی زبردست قدم اٹھانے سے احتراز کیا ہے۔ اس سلسلے میں ذرا اُن کی تصریحات ملاحظہ ہوں:

> "مغربی استعمار کے خلاف اگر کوئی سب سے بڑا الزام لگایا جا سکتا ہے تو وہ یہ نہیں کہ اس نے اپنے زیرِ اقتدار ممالک میں انقلابی روش اختیار نہیں کی۔ اس کے طرزِ عمل کے خلاف جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے مشرقی قوموں کو نئی تہذیب سے آراستہ کرنے، اور ان کے بوسیدہ معاشرتی ڈھانچوں کو مسمار کرنے میں پوری جرأت کا ثبوت نہیں دیا۔ اس نے تبدیلی کا آغاز تو کیا اور اس کے لیے زمین بھی ہموار کی لیکن تبدیلی کی رفتار مناسب حد تک تیز نہ ہو سکی۔ اس نے مغربی تہذیب کے پرستاروں کا کوئی ایسا مضبوط لشکر تیار نہ کیا جو آزادی کے بعد مغرب کے انقلابی عزائم کی پوری

قوت کے ساتھ تکمیل کرنے کے لیے بیتاب ہونا اور اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کرنا۔

مغربی تہذیب کے اثرات مشرقی معاشرے کی صرف سطح پر نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے اس کے رگ و پے میں سرایت نہیں کی۔ چنانچہ ہم یہاں اس تہذیب کے جتنے نقوش بھی دیکھتے ہیں اُن کی حیثیت خارجی مظاہر کی ہے، مثلاً کارخانوں کا قیام، شہروں کی آبادی میں اضافہ، جمہوری طرزِ حکومت، تعلیم یافتہ طبقے میں چند نئے افکار و نظریات کے چرچے اور مغربی زبانوں کی ترویج و ترقی۔ لیکن یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان تبدیلیوں سے صرف سوسائٹی کا ایک نہایت ہی مختصر سا طبقہ جسے ہم اونچا طبقہ کہتے ہیں، متاثر ہوا ہے۔ مگر ان ممالک کی عظیم اکثریت جو کسانوں اور مزدوروں پر مشتمل ہے، اس نے ان سے کوئی گہرا اثر نہیں لیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہاں کے مغرب زدہ طبقے نے بھی مغربی فلسفۂ حیات کو ابھی پوری طرح نہیں اپنایا اور نہ اس کے اندر یہ تڑپ پیدا ہوئی ہے کہ وہ اس فلسفہ کی روشنی میں اپنے قومی مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی جامع منصوبہ تیار کرے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مغربی افکار و نظریات کو اس مغرب زدہ طبقے نے اپنی شخصیت میں سمونے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اُس کے اندر ان تصورات کو غالب کرنے کی کوئی سچی امنگ پیدا ہوئی ہے۔ ایک مختصر سے گروہ نے مغرب سے صرف صنعتی ہنرمندی سیکھ لینے پر اکتفا کیا ہے لیکن اُس نے اُن اقدارِ حیات کی صحیح قدر و قیمت پہچاننے کی سعی نہیں کی جن پر مغربی معاشرے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ اہلِ مشرق اس تہذیب پر دل و جان سے ابھی تک ایمان نہیں لائے۔ اُن کے ہاں مغربی تمدن کے جو نشانات ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی حیثیت ظاہری رنگ و روغن سے کسی طرح زیادہ نہیں۔ ایک نہایت ہی مختصر اقلیت کو چھوڑ کر مغرب اہلِ مشرق کی رُوح کو تبدیل کرنے میں ناکام رہا ہے۔“

فاضل مصنف کے خیال میں مغربی تہذیب کی ساری امیدیں اسی "مختصر سی اقلیت" سے وابستہ ہیں۔ لیکن وہ اس گروہ کے اندر بھی بعض ایسی کوتاہیاں پاتے، جن کی وجہ سے اس کی کوششیں بارآور نہیں ہونے پاتیں۔ مصنف کے نزدیک اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے بیشتر افراد نے ابھی تک مغربی تہذیب کو اختیار کرنے میں پوری یکسوئی اختیار نہیں کی۔ اُن کے دل و دماغ کے دُور دراز گوشوں میں مذہبی اور قومی روایات کے نقوش باقی ہیں جن کی وجہ سے وہ کوئی واضح مقصد اور نصب العین متعین نہیں کر سکے۔

وہ مغربی تہذیب سے بلاشبہ کافی حد تک مرعوب ہیں اور اس تہذیب کو مشرقی ممالک میں پروان چڑھانے کے لیے دلی آرزو رکھتے ہیں لیکن "رجعت پسند عناصر" سے گھبرا کر وہ نہ تو اپنے اس ارادے کو واشگاف طور پر لوگوں پر ظاہر کرتے ہیں اور نہ ہی اسے پُورا کرنے کے لیے کوئی جرأت مندانہ قدم اٹھاتے ہیں بلکہ مغرب کی مادی اقدار اور مشرق کی روحانی اور اخلاقی اقدار کا ملغوبہ تیار کرکے اُسے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں لیکن متضاد عناصر کا یہ "معجون مرکب" کسی ایک طبقے کو بھی اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا اور عملی اعتبار سے کسی نظامِ حیات کے لیے بھی مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔

مغربی تہذیب کو اگر فی الواقع مشرق میں غلبہ حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے مندرجۂ ذیل تین تدابیر کو اختیار کرنا انتہائی ضروری ہے۔

(۱) انقلاب پسندوں کی ایک ایسی زبردست جماعت تیار کی جائے جو اگرچہ افراد کی تعداد کے اعتبار سے طاقتور نہ ہو لیکن مغربی تہذیب پر مضبوط ایمان رکھتی ہو اور اس بات پر پختہ یقین رکھتی ہو کہ اُن کے ملک اور قوم کی نجات صرف اسی تہذیب کو اپنانے میں ہے۔ پھر اس راہ میں جو مشکلات اور دشواریاں اُسے پیش آنے والی ہیں اُن کا وہ خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کے لیے بھی بالکل تیار ہو اور پورے عزم، یکسوئی اور جرأت کے ساتھ آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتی ہو۔

(ب) اس جماعت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ مادہ پرستانہ مسلک کا پرچار کرے اور لوگوں کو کھلے طور پر اس کی دعوت دے۔ مذہبی روایات نے اہلِ مشرق کو جن بندھنوں میں جکڑ رکھا ہے انہیں بے خوف ہو کر کاٹ دے اور اسی طرح لوگوں کو ان سے نجات دلائے۔

(ج) ریاست کے انتظام و انصرام کے لیے مشرق میں مضبوط حکومتیں قائم کی جائیں جو اجتماعی بچت اور سرمایہ کاری کے مختلف منصوبوں کو بالجبر نافذ کر کے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ یہ مقصد جمہوری نظامِ حکومت کے تحت حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے آمریت ناگزیر ہے تاکہ قوت کے زور سے یہ انقلاب برپا کیا جائے اور جو عناصر اس راہ میں حائل ہوں انھیں طاقت کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا جائے۔

مولانا مودودی سے ملیے تالیف: جناب اسعد گیلانی صاحب۔ ناشر: آزاد بک ڈپو، سرگودھا۔ سول ایجنٹ: بساطِ ادب چوک انارکلی لاہور۔ قیمت ساڑھے چھ روپے۔ صفحات ۲۱۴۔

زیر تبصرہ کتاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے افکار و تصورات کا خوبصورت مرقع ہے۔ کتاب کے مرتب چونکہ خود تحریکِ احیائے اسلام کے پرجوش مبلغ اور سپاہی ہیں اس لیے انھوں نے مولانا کے فکری اور عملی دونوں پہلوؤں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اُن کی شخصیت کا بے لاگ جائزہ لیا ہے۔ کتاب اوّل سے آخر تک بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے اور اسے پڑھ کر مولانا کی شخصی معاشرتی اور سیاسی زندگی، اُن کے اصول و نظریات کے ساتھ پوری طرح ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ پھر اس میں مبالغہ آمیزی کا وہ جز بھی شامل معلوم نہیں ہوتا جو عام طور پر مذہبی شخصیتوں کی تذکرہ نگاری میں پایا جاتا ہے۔

تواریخ عجیب المعروف کالا پانی تالیف مولوی محمد جعفر تھانیسری۔ مرتبہ محمد ایوب قادری۔ شائع کردہ: سلمان اکیڈمی۔ حق نشان۔ ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۵ قیمت چار روپے پچاس پیسے۔ صفحات ۳۰۴